باب (۱۱)

اِسراء و معراج

اب قبل اس کے کہ ہم مکّے کے آخری تین سالوں کی تاریخ بیان کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے سب سے اہم واقعہ کو تفصیل کے ساتھ پیش کر دیا جائے جو حضورِ انور کی سیرتِ پاک پر ایک مُرصّع تاج کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا ہے، ایسا تاج جس سے انبیاء سمیت تاریخ انسانی کے کسی فرد کی سیرت بھی مُزیّن نہیں ہوئی ہے۔ یہ ہے واقعۂ اِسراء و معراج۔ اِسراء سے مراد ہے رات کے وقت آپ کو مسجد حرام سے مسجد اقصٰی (بیت المَقدِس) تک لے جانا، جیسا کہ قرآن مجید سورۂ بنی اسرائیل کے آغاز میں بیان ہوا ہے۔ اور معراج سے مراد ہے آپ کا بیت المَقدِس سے سِدرَۃُ المُنتَہیٰ تک پہنچنا، جس کی پوری تفصیلات احادیث میں بیان ہوئی ہیں۔ اگرچہ بعض شاذ اقوال یہ بھی ہیں کہ اِسراء اور معراج کے واقعات الگ الگ اوقات میں پیش آئے ہیں، لیکن علمائے اُمت، فقہاء، محدثین اور متکلّمین کی عظیم اکثریت اِس بات پر متفق ہے کہ یہ دونوں واقعات بیک وقت پیش آئے تھے۔ ایک ہی رات آپ کو جسم و رُوح کے ساتھ بحالتِ بیداری مسجدِ حرام سے بیت المقدس بھی لے جایا گیا اور اسی رات آپ عالمِ بالا کی انتہائی بلندیوں سے گزرتے ہوئے بارگاہ رب العزّت تک بھی پہنچے، اور صبح ہونے سے پہلے مکّہ واپس بھی تشریف لے آئے۔

معراج کی تاریخ یہ واقعہ کب پیش آیا؟ اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ ابن سعد نے واقدی کی روایت نقل کی ہے کہ یہ ۱۷ رمضان ۱۲ھ بعدِ بعثت کو یعنی ہجرت سے ۱۸ مہینے پہلے پیش آیا[1]۔ دوسری سند سے

[1] جہاں یہ امر واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہجرت الی المدینہ سے پہلے بعد بعثت کی جو تاریخیں (باقی برصفحہ ۱۷)

ابن سعد ہی نے اسے ۱۷ ربیع الاوّل ۱۳ھ بعدِ بعثت، یعنی ہجرت سے ایک سال قبل کا واقعہ بیان کیا ہے۔ بیہقی نے موسیٰ بن عُقبہ کے حوالہ سے اور انہوں نے امام زُہری کے حوالہ سے بھی معراج کی یہی تاریخ بیان کی ہے، اور یہی عُروَہ بن زبیر کی روایت ہے جسے ابن لَہِیعَہ نے ابوالاسود کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ اِسی بنا پر امام نَوَوی نے اسی کو معراج کی صحیح تاریخ کہا ہے، اور ابن حزم نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے، اگرچہ یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ اسماعیل السُّدِّی سے اس کے بارے میں دو قول منقول ہوئے ہیں۔ طَبَری و بَیہقی نے ان کی جو روایت نقل کی ہے اس میں وہ معراج کو ہجرت سے ایک سال پانچ مہینے پہلے یعنی شوال ۱۲ھ بعدِ بعثت کا واقعہ بیان کرتے ہیں، اور حاکم کی روایت ایک سال ۳ مہینے قبل کی ہے جس کی رو سے یہ ماہ ذی القعدہ کا واقعہ قرار پاتا ہے۔ ابن عبدالبرؒ اور ابن قُتَیبَہؒ کا بیان ہے کہ یہ ہجرت سے ایک سال ۸ مہینے پہلے (یعنی رجب ۱۲ھ بعدِ بعثت) کا واقعہ ہے۔ ابن فارس نے اسے ہجرت سے ایک سال تین مہینے قبل کا، ابن الجوزی نے ۸ مہینے قبل کا، اور ابوالربیع بن سالم نے ۶ مہینے قبل کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اور ایک قول ۱۱ مہینے قبل کا بھی ہے جسے ابن المُنَیر نے سیرتِ ابن عبدالبرؒ کی شرح میں ترجیح دی ہے اور ابراہیم بن اسحاق الحَربی نے قطعیت کے ساتھ کہا ہے کہ یہی معراج کی تاریخ ہے۔ لیکن مشہور یہ ہے کہ معراج ۲۷ رجب کو ہوئی تھی، اور علامہ زُرقانی کی رائے یہ ہے کہ جب کسی قول کو دوسرے قول پر ترجیح دینے کے لیے کافی دلائل موجود نہیں ہیں تو مشہور قول ہی کو اختیار کر لینا بہتر ہے۔

تاریخی پسِ منظر یہ واقعہ تحریکِ اسلامی کے اُس مرحلے میں پیش آیا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو توحید کی آواز بلند کرتے ہوئے تقریباً ۱۲ سال گزر چکے تھے۔ آپ کے مخالفین آپ کا راستہ روکنے کے لیے سارے جتن کر چکے تھے، مگر ان کی مزاحمتوں کے باوجود آپ کی آواز عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی تھی۔ عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جس میں دوچار آدمی آپ کی دعوت سے متاثر نہ ہو چکے ہوں۔ خود مکے میں ایسے مخلص لوگوں کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶) متعین کر رہے ہیں وہ اُس حدیث پر مبنی ہیں جو بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوئی اُس وقت آپ چالیس سال کے تھے اس کے بعد آپ ۱۳ سال مکہ میں رہے، اور ۱۰ سال مدینے میں۔ اس روایت کی بنا پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہجرت ۱۳ھ بعدِ بعثت کے اختتام پر ہوئی۔

ایک مختصر جتھا بن چکا تھا جو اس دعوتِ حق کی کامیابی کے لیے ہر خطرہ انگیز کر جانے کو تیار تھے۔ مدینے میں اوس اور خزرج کے طاقتور قبیلوں کی بڑی تعداد آپ کی حامی بن چکی تھی۔ اب وہ وقت قریب آلگا تھا جب آپ کو مکے سے مدینے کی طرف منتقل ہو جانے اور منتشر مسلمانوں کو ایک جگہ سمیٹ کر اسلام کے اصولوں پہ ایک معاشرہ اور ریاست قائم کر دینے کا موقع ملنے والا تھا۔ ان حالات میں معراج پیش آئی اور واپسی پہ وہ پیغام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو سنایا جو سورۂ بنی اسرائیل میں درج ہے۔

واقعہ کا مجمل بیان سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں صرف مسجدِ حرام (یعنی بیت اللہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک حضورؐ کو لے جانے کی تصریح کی گئی ہے، اور اس کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اپنی کچھ نشانیاں دکھانا چاہتا تھا۔ اس سے زیادہ کوئی تفصیل قرآن میں نہیں بتائی گئی۔ لیکن حدیث اور سیرت کی کتابوں میں اس واقعہ کی تفصیلات بکثرت صحابہ سے مروی ہیں جن کی تعداد ۲۵ تک (بلکہ مزید استقصاء کرنے سے ۴۵ تک) پہنچتی ہے۔ ان میں سے مفصل ترین روایات حضرت انسؓ بن مالک، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوسعیدؓ خدری، حضرت مالکؓ بن صَعصعہ، حضرت ابوذرؓ غفاری، حضرت شدادؓ بن اوس، حضرت عبداللہؓ بن عباس، حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور حضرت اُمّ ہانیؓ سے مروی ہیں۔

حدیث میں جو تفصیلات آئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ رات کے وقت جبریل علیہ السلام آپ کو اٹھا کر مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک براق پر لے گئے۔ وہاں آپ نے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز ادا کی۔ پھر وہ آپ کو عالمِ بالا کی طرف لے چلے اور وہاں مختلف طبقاتِ سماوی میں مختلف جلیل القدر انبیاء سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ آخر کار آپ انتہائی بلندیوں پہ پہنچ کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوئے اور اس حضوری کے موقع پہ دوسری اہم ہدایات کے علاوہ آپ کو پنج وقتہ نماز کی فرضیت کا حکم دیا گیا۔ اس کے بعد آپ بیت المقدس کی طرف پلٹے اور وہاں سے مسجد حرام واپس تشریف لے آئے۔ اس سلسلہ میں بکثرت روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو جنت اور دوزخ کا بھی مشاہدہ کرایا گیا۔ نیز معتبر روایات یہ بھی بتاتی ہیں کہ دوسرے روز جب آپؐ نے اس واقعہ کا لوگوں سے ذکر کیا تو کفارِ مکہ نے اس کا بہت مذاق اڑایا اور مسلمانوں میں سے بھی بعض کے ایمان متزلزل ہو گئے۔

حدیث کی یہ زائد تفصیلات قرآن کے خلاف نہیں بلکہ اس کے بیان پہ اضافہ ہیں اور ظاہر ہے کہ اضافے کو قرآن کے خلاف کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا۔

معراج جسمانی تھی یا روحانی معراج کے اس سفر کی کیفیت کیا تھی؟ یہ عالمِ خواب میں پیش آیا تھا یا بیداری میں؟ اور آیا

حضورؐ بذاتِ خود تشریف لے گئے تھے یا اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے محض روحانی طور پر ہی آپ کو یہ مشاہدہ کرادیا گیا؟ ان سوالات کا جواب قرآن مجید کے الفاظ خود دے رہے ہیں۔ سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی سے بیان کی ابتداء کرنا خود بتا رہا ہے کہ یہ کوئی بہت بڑا خارقِ عادت واقعہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدرت سے رُونما ہوا۔ ظاہر ہے کہ خواب میں کسی شخص کا اس طرح کی چیزیں دیکھ لینا، یا کشف کے طور پر دیکھنا یہ اہمیت نہیں رکھتا کہ اسے بیان کرنے کے لیے اس تمہید کی ضرورت ہو کہ "تمام کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو یہ خواب دکھایا یا کشف میں یہ کچھ دکھایا"۔ پھر یہ الفاظ بھی "کہ ایک رات اپنے بندے کو لے گیا" جسمانی سفر پر صریحاً دلالت کرتے ہیں۔ خواب کے سفر یا کشفی سفر کے لیے "لے جانے" کے الفاظ کسی طرح موزوں نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا ہمارے لیے یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ یہ محض ایک روحانی تجربہ نہ تھا، بلکہ ایک جسمانی سفر اور عینی مشاہدہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کرایا۔

اب اگر ایک رات میں ہوائی جہاز کے بغیر مکہ سے بیت المقدس جانا اور آنا اللہ کی قدرت سے ممکن تھا تو آخر اُن دوسری تفصیلات ہی کو ناممکن کہہ کر کیوں رد کر دیا جائے جو حدیث میں بیان ہوئی ہیں۔ ممکن اور ناممکن کی بحث تو صرف اُس صورت میں پیدا ہوتی ہے جبکہ کسی مخلوق کے بااختیار خود کوئی کام کرنے کا معاملہ زیرِ بحث ہو۔ لیکن جب ذکر یہ ہو کہ خدا نے فلاں کام کیا تو پھر امکان کا سوال وہی شخص اُٹھا سکتا ہے جسے خدا کے قادرِ مطلق ہونے کا یقین نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے آناً فاناً ایسی جگہ لے جاسکتا ہے جہاں عالمِ مادی کی سب سے تیز رفتار چیز یعنی روشنی کو پہنچنے میں بھی اربوں سالِ نوری درکار ہوتے ہیں۔ زمان و مکان کی قیود مخلوقات کے لیے ہیں، خالقِ کائنات کے لیے نہیں ہیں۔

منکرینِ حدیث کے اعتراضات

سفر معراج کی جو تفصیلات حدیث میں آئی ہیں اُن پر منکرینِ حدیث کی طرف سے متعدد اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ مگر ان میں سے صرف دو ہی ایسے ہیں جو کچھ وزن رکھتے ہیں۔

ایک یہ کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا کسی خاص مقام پر مقیم ہونا لازم آتا ہے، ورنہ اس کے حضور بندے کی پیشی کے لیے کیا ضرورت تھی کہ اسے سفر کرا کے ایک مقام خاص تک لے جایا جاتا؟

دوسرے یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دوزخ اور جنت کا مشاہدہ اور بعض لوگوں کے مبتلائے عذاب ہوتے کا معائنہ کیسے کرایا گیا، جبکہ ابھی بندوں کے مقدمات کا فیصلہ ہی نہیں ہوا ہے؟ یہ کیا بات ہوئی کہ سزا و جزا کا فیصلہ تو ہونا ہے قیامت کے بعد اور کچھ لوگوں کو سزا دے ڈالی گئی ابھی سے۔

لیکن دراصل یہ دونوں اعتراض بھی قلتِ فکر کا نتیجہ ہیں۔ پہلا اعتراض اس لیے غلط ہے کہ خالق اپنی ذات میں تو بلاشبہ اطلاقی شان رکھتا ہے مگر مخلوق کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ اپنی کسی کمزوری کی بناء پر نہیں بلکہ مخلوق کی کمزوریوں کی بناء پر محدود وسائط اختیار کرتا ہے۔ مثلاً جب وہ مخلوق سے کلام کرتا ہے تو کلام کا وہ محدود طریقہ استعمال کرتا ہے جسے ایک انسان سُن اور سمجھ سکے۔ حالانکہ بجائے خود اللہ کا کلام ایک اطلاقی شان رکھتا ہے۔ اسی طرح جب وہ اپنے بندے کو اپنی سلطنت کی عظیم الشان نشانیاں دکھانا چاہتا ہے تو اسے لے جاتا ہے اور جہاں جو چیز دکھانی ہوتی ہے اسی جگہ دکھاتا ہے، کیونکہ بندہ ساری کائنات کو بیک وقت اُس طرح نہیں دیکھ سکتا جس طرح خدا دیکھتا ہے۔ خدا کو کسی چیز کے مشاہدے کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر بندے کو ہوتی ہے۔ یہی معاملہ خالق کے حضور باریابی کا بھی ہے کہ خالق بذاتِ خود کسی مقام پر متمکن نہیں ہے۔ مگر بندہ اس کی ملاقات کے لیے ایک جگہ کا محتاج ہے جہاں اس کے لیے تجلّیات کو مرکوز کیا جائے۔ ورنہ اس کی شانِ اطلاق میں اُس سے ملاقات بندۂ محدود کے لیے ممکن نہیں ہے۔

رہا دوسرا اعتراض تو وہ اس لیے غلط ہے کہ معراج کے موقع پر بہت سے مشاہدات جو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو کرائے گئے تھے، ان میں بعض حقیقتوں کو مُمَثَّل کرکے دکھایا گیا تھا۔ مثلاً ایک فتنہ انگیز بات کی یہ تمثیل کہ ایک ذرا سے شگاف میں سے ایک موٹا سا بیل نکلا اور پھر اُس میں واپس نہ جا سکا، یا زناکاروں کی یہ تمثیل کہ ان کے پاس تازہ نفیس گوشت موجود ہے مگر وہ اسے چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے ہیں۔ اسی طرح بُرے اعمال کی جو سزائیں آپؐ کو دکھائی گئیں وہ بھی تمثیلی رنگ میں عالمِ آخرت کی سزاؤں کا پیشگی مشاہدہ تھیں۔

اصل بات جو معراج کے سلسلے میں سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام میں سے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے اُن کے منصب کی مناسبت سے مَلَکُوتُ السّمٰوات و الارض کا مشاہدہ کرایا ہے اور مادّی حجابات بیچ میں سے ہٹا کر آنکھوں سے وہ حقیقتیں دکھائی ہیں جن پر ایمان بالغیب لانے کی دعوت دینے پر وہ مامور کیے گئے تھے، تاکہ اُن کا مقام ایک فلسفی کے مقام سے بالکل ممیّز ہو جائے۔ فلسفی جو کچھ بھی کہتا ہے قیاس اور گمان سے کہتا ہے۔ وہ خود اگر اپنی حیثیت سے واقف ہو تو کبھی اپنی کسی رائے کی صداقت پر شہادت نہ دے گا۔ مگر انبیاء جو کچھ کہتے ہیں وہ براہِ راست علم اور مشاہدے کی بناء پر کہتے ہیں۔ اور وہ خلق کے سامنے یہ شہادت دے سکتے ہیں کہ ہم ان باتوں کو جانتے ہیں اور یہ ہماری آنکھوں دیکھی حقیقتیں ہیں۔ (باقی)